



## اپنوں کے سنگ

ستہ العین حرم ہاشمی

سے اسے نیا گھر سیٹ کرنے کے بارے میں مختلف مشورے دے رہی تھیں۔ امیر کی بات سن کر کچھ دیر پہلے بہت غلوں سے دیے گئے اپنے قیمتی مشوروں پر شرمندہ ہو کر رہ گئیں۔

”تم یہ چائے لو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ یاسمین بھابی نے جلدی سے کہا۔

امیر نے ایک ادا سے اپنے خوب صورت کٹے ہوئے سلی بالوں کو پیچھے کیا اور زراکت سے چائے کا کپ اٹھا کر ایک گھونٹ لیا اور پھر برا سامنے بنا کر رہ گئی۔

”دراصل یاسمین بھابی! امریکا میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ وہاں کوئی اتنا فارغ نہیں ہے کہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی کرے مگر یہاں تو چھوٹی سی چھوٹی بات میں بھی دوسروں کو مشورے دینا اخلاقی فرض سمجھا جاتا ہے۔ سچ پوچھیں تو میں اکثر بہت چڑھتی ہوں مگر پھر کیا کروں۔ خیام کی ضد ہے کہ اب پاکستان میں ہی سیشن ہوتا ہے۔ اس لیے سب برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔“

سامنے بیٹھی یاسمین بھابی جو بہت جوش و خروش

”لگتا ہے یا سکین بھابی! آپ خالص دودھ نہیں لیتی ہیں۔ کتنی بد مزہ چائے ہے۔“ امبر نے کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”دودھ تو خالص ہی ہے۔ شاید چائے ٹھیک نہیں بنی۔ میں دوبارہ بنا دیتی ہوں۔“ یا سکین نے شرمندگی سے کہا اور اپنے سر پر رکھے دوپٹے کو مزید درست کرتے ہوئے صوفے سے اٹھنے لگیں جب امبر نے ہاتھ بڑھا کر انہیں روکا۔

”نہیں رہنے دیں! اس وقت ویسے بھی چائے کا موڈ نہیں ہے۔“ امبر نے کہا تو یا سکین بھابی دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ کر اسے دوسری چیزیں سرد کرنے لگیں۔ جب بیڈ سنٹن کا ریٹک پکڑے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کنزنی اندر داخل ہوئی۔

”مگر چچی جان! اہل تو آپ کہہ رہی تھیں کہ یہاں کی چائے بہت مزے کی ہے! آج کیسے بری ہو گئی؟“

”میں سالہ کنزنی نے پاس آتے ہوئے کہا تو امبر کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔“

”ویسے یا سکین برا مت ماننا! تمہاری کنزنی کچھ زیادہ ہی آؤٹ اسپوک ہے۔ میرے خیال سے یہ تمہارا کام ہے کہ اسے بڑے چھوٹے کی عزت کرنا سکھاؤ۔“

امبر کے کہنے پر یا سکین بھابی نے ایک سخت نظر کنزنی پر ڈالی جو حیرت سے آنکھیں پھاڑے اپنی اسٹائش چاچی کو دیکھ رہی تھی۔

”مگر چچی جان! آؤٹ اسپوک ہونا تو ”وہاں“ بہت بڑی خوبی نہیں سمجھا جاتا؟“ کنزنی کے کہنے پر امبر جڑ بڑھ کر رہ گئی۔

”یہ تم کیا مجھے چچی جان کہتی رہتی ہو؟ کتنا پنڈت اور آؤٹ ڈیٹڈ لگتا ہے! تم مجھے آئی کہا کرو بس!“ امبر کو کچھ اور سمجھ نہیں آیا تو کسی اور بات کو لے کر چڑھائی کر دی۔

”میں تو آپ کو آئی کہہ لوں مگر۔۔۔!“ کنزنی کچھ کہتے، کہتے چپ کر گئی۔

”مگر کیا؟“ امبر نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اگر آپ کی ساسو ماں نے میرے منہ سے یہ

بدیسی لفظ سن لیا ناں تو وہ آپ کو تو کچھ نہیں کہیں گی مگر میری شامت ضرور آ جائے گی۔ اس لیے اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو چچی جان کے بجائے آئی شانی جیسے ناموں سے پکاروں تو آپ مجھے ہائی کورٹ کے آرڈر لا دیں پھر دیکھیں میری زبان کے کرشمے.....“ کنزنی نے اطمینان سے کہا اور ماں کی گھوری کو نظر انداز کرتے ہوئے چائے کی ٹرائی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”وہ تو میں اب بھی دیکھ رہی ہوں۔“ امبر بڑبڑائی۔

”پیاری چچی جان! آپ نے کچھ کہا؟“ کنزنی نے معصومیت سے پیٹری کی بائیسٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں تو اور ویسے تم اتنا بیٹھا کیوں کھاتی ہو؟ پہلے ہی تمہارا وزن زیادہ ہے۔ اپنی ڈائنٹ پر کنٹرول کرو لڑکی۔ کل کو تمہاری شادی بھی ہوئی ہے۔ میری بیٹی تم سے دو سال ہی چھوٹی ہے مگر اس کے لیے رشتوں کی لائن لگی ہوئی ہے۔“ امبر نے فخریہ انداز میں کہا۔

”جی چچی جان! ایسی لائن ہمارے یہاں اکثر بینک کے سامنے مل جمع کروانے کے لیے بھی لگی ہوئی ہے مگر چ پوچھیں تو ہم نے کبھی غور نہیں کیا۔“ کنزنی نے اطمینان سے جواب دیا اور پیٹری ختم کر کے پیڑے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

یا سکین نے چائے کی ٹرائی فوراً پیچھے کی۔ کنزنی نے احتجاجی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا مگر وہاں نو لفٹ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے فربہی مائل جسم کی وجہ سے پریشان رہتی تھیں۔ آج تو امبر نے بھی کہہ دیا تھا۔ اسی وقت ملازمہ آئی اور یا سکین کے کہنے پر چائے کی ٹرائی وہاں سے لے گئی۔

”کنزنی کے لیے کچھ رکھتے آئے تو ہیں مگر اس کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔“ یا سکین بھابی نے اپنے مخصوص نرم لہجے میں وضاحت دی۔

”خیر عراب کوئی اتنی بھی کم نہیں ہے!“ امبر نے جھکے انداز میں کہا۔

”تو اور کیا.....! ان کی بیٹی سے بس دو سال ہی تو بڑی ہوں۔۔۔ ہے ناں پیاری چچی جان!“ کنزنی نے

”ایسی سے کیا مراد؟“

”میرا مطلب ہے ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہنے والی۔ کبھی جوان کے پاس فرصت ہو کسی سے ملنے کی بات کرنے کی۔ کہنے کو تو ساتھ والے گھر میں رہتی ہیں مگر ملاقات کے لیے بھی بہت سوچ سمجھ کر وقت نکالتی ہیں۔ وہ تو شکر ہے کہ قیتوں بچے ان پر نہیں گئے بلکہ خیام چاچو جیسے ہیں۔ دوستانہ مزاج والے، مخلص سے، اچھے بچے۔“ کنزئی نے ہمیشہ کی طرح صاف گوئی سے کہا تو یاسمین گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

”دراصل امیر کو کبھی اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ ہم سب میں مکمل مل پائی۔ شادی کے کچھ عرصے کے بعد ہی تمہارے خیام چچا باہر چلے گئے۔ اب اتنے سالوں کے بعد یہ لوگ واپس لوٹے ہیں۔ کچھ وقت تو لگے گا، ہی... انہیں یہاں سیٹ ہونے میں۔“ یاسمین نے سنجیدگی سے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کچھ یاد آنے پر کنزئی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”اور یہ جو تمہیں عادت ہے ناں ہر کسی سے سوال جواب کرنے کی۔ اس پر قابو پاؤ۔ اماں جی کے لاڈ پیار نے تمہیں بگاڑ دیا ہے۔“

”یہ بات آپ اماں جی کو بھی سمجھائیں ناں امی جی! قسم سے میرا بہت دل کرتا ہے کہ میں بھی سدرھا جاؤں۔“ کنزئی کے کہنے پر یاسمین نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا۔ جب اس کی تک، تک سن کر فوراً چپ کر گئیں۔

”بڑی بہو! کس کو نیدھار نے کی باتیں ہو رہی ہیں۔“ دادی اماں نے اپنے مخصوص دنگ انداز میں سوال کیا۔

”کچھ نہیں اماں جی! میں تو بس ویسے ہی.... آپ چائے لیں گی؟“ یاسمین نے جلدی سے موضوع بدلا اور ساتھ ہی بیٹی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

”میری پیاری دادی جان!“ کنزئی لاڈ سے کہتے ہوئے ان کے گلے لگ گئی۔

”آج میری بچی! کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی! بھول گئی آج ٹاپ تھری کا مقابلہ تھا ہمارا؟“ دادی

مخصوصیت سے کہا تو وہ کچھ کہتے، کہتے رک گئی۔

”مجھے کیا!“ امیر بڑبڑائی! جیسے کہہ رہی ہو کہ بھاڑ... میں جاؤ اپنے بیش قیمت فون پر تیزی سے انگلیاں چلاتی امیر نے ایک طنزیہ نظر ماں بیٹی پر ڈالی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آج خیام کے ساتھ ایک ڈنر پر جانا ہے۔ میں اب چلتی ہوں۔“ اس نے کہتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور ایک ادا سے بالوں کو جھٹکتے ہوئے ہانک ہانک کی ٹنگ، ٹنگ کرتی وہاں سے چلی گئی۔

”ہائے امی! بچی جان کے بھی کیا انداز ہیں۔ آپ بھی کچھ سیکسین ان سے!“ کنزئی نے اپنی سیدھی سادی مگر سوہری ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تم اپنی حرکتوں سے کب باز آؤ گی! سب کہتے ہیں کہ اکلوتی بیٹی کو کچھ زیادہ ہی سرچڑھایا ہوا ہے۔“ یاسمین نے غصے سے کہا۔

”وہ سب آپ کے اگلوتے بیٹے کے بارے میں کچھ نہیں کہتے کیا؟“ کنزئی نے حفظانِ قدم کے طور پر تھوڑا پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

”میرا بیٹا تو لاکھوں میں ایک ہے! تم سے زیادہ فرمانبردار اور اموصوم سا۔“ ان کے لہجے میں شہد کھل گیا۔

”بس امی! آپ کا یہ امتیازی سلوک ہی مجھے ”باغی“ بننے پر مجبور کرتا ہے! وہ کیا گانا ہے ناں کہ...“

بیرادے بھرا ہو جاؤں نہ میں باغی.....!“ کنزئی نے لہک کر گانا شروع کیا۔

”اُف چپ کر جاؤ بے ٹری لڑکی!“ یاسمین نے اپنے کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”بے عزتی جی نہیں ہو گئی۔“ کنزئی بڑبڑائی۔ پھر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولی۔ ”ویسے امی ایک بات تو بتائیں۔“

”وہ کیا؟“ یاسمین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”امی کیا آپ کی دیورانی شروع سے ایسی ہیں؟“ اس کے سوال پر یاسمین نے اسے کھورا۔

”سوری دادی جان!“ کنزئی نے کان پکڑتے ہوئے کہا۔

”دکس بات پر لڑکی! چھوڑو اور مجھے رات والے ڈرامے کی فنی قسط کا بتاؤ۔ رات دو اکھا کر جلدی سو گئی تھی۔ پتا نہیں آگے کیا ہوا تھا۔“

دادی جان نے اپنے پسندیدہ ڈرامے کا نام لیتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور جلدی سے آئی پیڈ اٹھا کر لے آئی۔ جب تک یاسمین چائے بنا کر لائیں۔ دونوں دادی اور پونی پوری طرح ڈرامے میں گم تھیں۔

”حد ہے مچی!“ یاسمین نے گہری سانس لی اور چائے رکھ کر خاموشی سے پلٹ گئیں۔

☆☆☆

”یہ تم ہر روز اس وقت کہاں جاتی ہو؟“ امبر نے خیزی سے سیزھیاں اترتی میرب سے پوچھا تو اس نے رک کر جرئت سے ماں کی طرف دیکھا۔

”مما! پہلے تو آپ نے بھی ایسا سوال نہیں کیا تھا؟ پاکستان آکر آپ میں بہت پیچھے آ گیا ہے۔ امیرنگ!“ کالے رنگ کی گھڑی اور جینز میں ملیں میرب نے مسکراتے ہوئے کہا تو امیر جزیزی ہو کر رہ گئی۔

”خیر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ امبر نے خود کو بے پروا غماہ کرتے ہوئے کہا۔ میرب نے بحث نہیں کی۔

”میں دادی جان کے پاس جا رہی ہوں۔ اس وقت وہاں سب جمع ہوتے ہیں۔ سچ بہت، بہت مزہ آتا ہے۔ آپ بھی چلیں۔“ میرب نے پرجوش انداز میں کہا تو امبر منہ بنا کر رہ گئی۔

”تمہیں ان بور لوگوں میں کیا مزہ آتا ہے میرب؟ بالکل الگ ماحول اور باتیں ہیں ان کی۔“ امبر نے حیرت سے سوال کیا۔

”مما! یہی تو سب سے زیادہ دلچسپ بات ہے۔ بابا ٹھیک کہتے ہیں کہ اپنی زمین اور اپنے لوگوں کی تلاش ہی اور ہوتی ہے۔ میں تو جج میں بہت انجوائے کرتی ہوں اور میں جب اپنی فریڈم کو یہ سب بتاتی ہوں تو وہ بہت حیران ہوتی ہیں۔“ میرب نے خوشی سے بتایا۔ اسی وقت خیام بھی گھر میں داخل ہوئے۔

اماں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

”کیا فائدہ دادی جان! ہر بار تو میں جیت جاتی ہوں آپ سے لوڈو میں۔“ کنزئی نے کہا تو دادی جان نے اس کا کان پکڑ لیا۔

”کیا کھالڑکی؟ ہر بار؟“

”اچھا، اچھا سوری دادی جان! کبھی، کبھی تو جیت ہی جاتی ہوں۔“ کنزئی نے دہائی دی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کا کان چھوڑ دیا۔

”تمہاری دادی کو لوڈو میں ہرانے والا ابھی کوئی نہیں پیدا ہوا۔ تمہارے دادا جان بھی ہمیشہ یہی دعویٰ کرتے تھے مگر باہر ہی ان کا مقدر رہی۔“ دادی جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس لیے دادا جان نے اوپر کا کلٹ بھی جلدی کٹوا لیا۔ اب وہاں حوروں کے ساتھ لوڈو کھیلتے ہوں گے۔“ کنزئی نے کہا تو یاسمین نے ایک دھبہ اس کے کندھے پر ماری۔

”امبر ٹھیک کہتی ہے تمہیں بڑوں سے بات کرنے کی تیز نہیں ہے۔“ یاسمین نے غصے سے کہا مگر جیسے ہی ان کی نظر دادی جان کے سنجیدہ چہرے پر پڑی تو فوراً اثر مندہ ہو کر پیچھے ہٹیں۔

”تم تو میرے لیے چائے بنانے لگی تھی ناں! اور کنزئی کے بارے میں یہ کل فٹانی تمہاری ذہن و فطین دیورانی نے کب کی ہے؟“

”ابھی دس منٹ پہلے دادی جان!“ کنزئی نے جلدی سے کہا مگر ماں کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ بہت غصے میں تھیں۔

”اچھا، اچھا! ملکہ عالیہ آئی تھیں اور ہم سے ملے بغیر تشریف لے گئیں۔“ دادی جان نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”اسے آج خیام کے ساتھ ڈنر پر کہیں جانا تھا اس لیے۔“ یاسمین نے جلدی سے کہا۔

”تم جاؤ اور ابھی سی چائے بنا کر لاؤ۔“ دادی جان نے ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا تو وہ سر ہلاتی وہاں سے چلی گئیں۔

## اپنوں کے سنگ

”خیام صاحب! آپ شاید بھول رہے ہیں کہ اب یہاں کا ماحول بھی بہت آزاد ہو چکا ہے۔ کچھ اور نہیں تو پہلے دور کی ڈرینگ اور آج کے دور کی ڈرینگ میں ہی نمایاں فرق دیکھ لیں اور ویسے بھی موبائل اور انٹرنیٹ نے کون سے فاصلے رہنے دیے ہیں۔“ امبر اپنی بات پر قائم تھی۔

”سب مانتا ہوں مگر پھر بھی، اب بھی یہاں تہذیب اور روایت زندہ ہے۔ ہر معاشرے میں اچھائیاں اور برائیاں تو ہوتی ہیں مگر ہر معاشرے کے وہ ستون جس پر اس معاشرے کی بنیاد کھڑی ہوتی ہے، وہ الگ، الگ ہوتے ہیں۔ اب یہ تو تسلی ہے کہ ہماری بنیاد مشرقی روایات سے جڑی ہوئی اور بہت مضبوط ہے۔“ خیام نے بھی اطمینان سے جواب دیا تو وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

”باقی سب تو ٹھیک ہے مگر میں اپنے بچوں کی زندگی کے فیصلے آپ کے جذبات کی نذر نہیں ہونے دوں گی۔“ امبر نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ خیام نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیسے فیصلے؟ اگر تم میرب اور دونوں بیٹوں کے رشتوں کی بات کر رہی ہو تو.....“ خیام نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔

”بھائی جان نے فیضان کے لیے میرب کا ہاتھ مانگا تو میں ایک لمحہ بھی سوچنے میں نہیں لگاؤں گا اور فوراً ہاں کر دوں گا۔ میری میرب اپنوں میں جائے، مجھے اس سے بڑی کیا خوشی ہوتی ہے اور جہاں تک بات دونوں بیٹوں کی ہے تو وہ ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ زین اور آذر اویلول کر رہے ہیں۔ انہیں ابھی اپنا مستقبل بنانا ہے۔“ خیام نے سنجیدگی سے کہا تو امبر پہلو بدل کر رہ گئی۔ اسے یہ ہی تو خدشہ تھا کہ کہیں میرب کا رشتہ فیضان سے نہ ہو جائے۔

”ویسے تم اتنی فکر کیوں کر رہی ہو؟ میرا نہیں خیال کہ وہ لوگ میرب کے لیے ایسا سوچیں گے کیونکہ تم کچھ بھی کہو میرب پر وہاں کا رینگ ابھی کافی گہرا ہے۔ کچھ وقت تو لگے گا اسے یہاں کا کچر سمجھنے میں مگر ہو سکتا ہے کہ

”میری بیٹی کی کس بات پر سب حیران ہوئے ہیں بھئی؟“ خیام نے کوٹ صوفے کی پشت پر رکھتے ہوئے چہرے پر اچھی مسکراہٹ سجا کر پوچھا۔ میرب نے جلدی سے باپ کو سلام کیا اور میز پر رکھے پانی کے جگ میں سے گلاس بھرا اور باپ کو پیش کیا۔ خیام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”بابا! جب تاپا ابو گھر آتے ہیں ناں تو کسزئی سلام کر کے سب سے پہلے انہیں پانی کا گلاس پیش کرتی ہے۔ میں نے یہ اس سے سیکھا ہے۔“ میرب نے فخریہ لہجے میں کہا تو انہوں نے جتنی ہوئی نظروں سے پوی کی طرف دیکھا۔ جس نے منہ پھیر لیا۔ خیام نے گلاس لے کر یوں سے لگا لیا۔

”بہت شکریہ بیٹا۔“ خیام نے کہتے ہوئے اس کا سر تھپتھپایا تو وہ مسکراتے ہوئے پلٹ گئی۔

”بابا! میں داؤی جان کے گھر جا رہی ہوں۔“ میرب نے گلاس واپس رکھ کر لاؤنج کے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”میں بھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ اماں سے ملے کافی دن ہو گئے ہیں۔“ انہوں نے کہا تو میرب ہاتھ ہلاتی ہوئی چلی گئی۔

”دیکھا تم نے! میں نے بروقت کتنا ٹھیک قدم اٹھایا پاکستان آنے کا۔“ خیام نے فخریہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہونہ! میرب وہاں بھی اپنی حدود میں رہنا جانتی تھی خیام! پاکستان آنا ضروری نہیں تھا۔“ امبر نے پاس بیٹھے ہوئے کہا۔

”ہاں مگر کب تک؟ وہ وہاں کی آزاد فضاؤں میں حتمی دیر تک اپنی حدود کو لے کر چل سکتی تھی۔ تم چاہے مایہ ناز یا نہ مایہ ناز ہر معاشرے کے کچھ اصول و ضابطے ہوتے ہیں۔ جس کے اثرات وہاں کے رہنے والے لوگوں پر پڑتے ہی ہیں۔ نہ چاہے ہوئے بھی نہیں بہت سی ایسی باتوں کو ماننا پڑتا ہے، جس کے لیے دل تیار نہیں ہوتا۔ اب کم از کم یہ ڈر تو نہیں ہے یہاں۔“ خیام نے مائی کی بات دھکیلی کرتے ہوئے کہا۔

کہا۔ کنزئی نے سکھ کی سانس لی کہ ان کا دھیان بٹ گیا۔ میرب نے بہت دچکپی سے اس منظر کو دیکھا۔

”داوی جان! آپ سچ میں بہت لکھی ہیں۔ آپ کو دادا جان جیسے لائف پارٹنر کا ساتھ ملا۔“ میرب نے سائڈ میز پر رکھی داوی جان کی تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سچ کہا! ایک اچھا ہم سفر آپ کی عامی زندگی کو بھی بہت خاص بنا دیتا ہے۔ اللہ سے ہمیشہ اپنے اچھے نصیب کی دعا مانگنی چاہیے۔“ داوی جان نے نرمی سے کہا۔

”میربے لیے تو آپ ہیں ناں! ڈھیر ساری دعا کیا کریں۔“ کنزئی نے بے پروائی سے کہا۔

”نہیں بچی! اپنے لیے خود بھی دعا کرنی چاہیے۔ دعا کا مضبوط ہالہ آنے والی بہت سی مشکلوں سے محفوظ رکھتا ہے۔“

”داوی جان! میں بھی اپنے لیے دعا کروں گی۔“ میرب نے فوراً کہا تو کنزئی بے ساختہ ہنس پڑی۔

”تمہیں بہت جلدی ہے یا گھر جانے کی!“ کنزئی کے کہنے پر میرب نے نفی میں سر ہلایا۔

”کیا دعا صرف یہی مانگی جاتی ہے؟ دعا تو دعا ہے اور داوی جان نے ہی کہا ہے کہ دعا خیر ہے۔ میں اپنے لیے خیر ہی مانگوں گی، ہر قدم پر!“ میرب نے مضبوط جھج میں کہا

تو داوی جان نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”شاباش بچی! بہت جلدی سمجھتی ہو۔“

”داوی جان! مجھے بھی چکی دیں۔ قسم سے بہت ضرورت ہے آج کل!“ کنزئی نے شرارت سے کہا۔

”تمہیں تو یہ ملے گا۔“ داوی جان نے اپنا ہاتھ اٹھایا تو کنزئی ہنستے ہوئے آگے ہوئی۔

”یہ بھی چلے گا! بس ذرا پیار سے۔“ کنزئی کے کہنے پر وہ تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

☆☆☆

”امیر بیٹی کیا خیاں کا کام ٹھیک نہیں چل رہا ہے؟“ بڑے سے لان میں ڈھکی شام میں داوی جان کے ساتھ یاسمین اور امیر کے ساتھ کنزئی اور میرب بھی بیٹھی ہوئی تھیں جب داوی جان نے اچانک

چھوٹی بہو کو مخاطب کیا۔

تب تک فیضان کا رشتہ کہیں اور طے ہو جائے۔ آخر اتنے لائق اور قابل لڑکے کے لیے رشتوں کی کمی ہے کیا؟“

خیام نے میرب کی ناڈرن ڈریسنگ کے بارے میں سوچتے ہوئے افسردگی سے کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ امیر اپنی سوچوں میں گم ہونے لگی۔

☆☆☆

”داوی جان کیا سچ میں؟“ میرب نے ان کی بات سن کر حیرت سے سوال کیا۔ وہ اور کنزئی، داوی

جان کے کمرے میں موجود تھیں۔ داوی جان بیڈ پر نیم دراز تھیں اور وہ دونوں ان کے دائیں بائیں بیٹھی ہوئی

تھیں۔ کنزئی کے لیے تو داوی جان کی باتیں اور قصے نئے نہیں تھے مگر پھر بھی وہ ہر بار اسی دچکپی سے سستی جیسے پہلے بار سن رہی ہو۔ جبکہ میرب ہر بات سن کر حیرانی

سے ایک ہی سوال کرتی۔

”داوی جان کیا سچ میں؟“

”اور نہیں تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“

داوی جان نے منہ ہناتے ہوئے کہا۔

”نہیں داوی جان! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“ میرب پریشان ہو گئی کہ داوی جان کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔

”تمہارے دادا جان پڑھے لکھے اور ذہین آدمی تھے۔ وہ اپنی روایات پر جان دیتے تھے مگر اس کا ہرگز

مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی بیوی کو قید کر کے رکھتے۔

بیوی کیا وہ تو اپنی بہنوں کے لیے بھی اتنے ہی کھلے دل و ذہن کے مالک تھے۔ گاڑی چلانے سے لے کر، ہر

طرح کی آزادی ہمیں حاصل تھی۔ اچھے سے اچھا پہننا اور ہننا، جگہ، جگہ کی سیر کو جانا، گھومنا پھرنا، تمہارے دادا

جان کے ہوتے ہوئے میں نے بہت شاہانہ زندگی گزاری ہے۔“ داوی جان نے بڑے دؤں کو یاد کرتے

ہوئے کہا۔ ان کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔

”اس کا مطلب تو یہ ہے داوی جان کہ بیٹوں نے آپ کو اچھا نہیں رکھا ہوا؟“ کنزئی نے کہا تو داوی

جان اس کا کان پکڑنے کے لیے آگے ہو گئیں۔ وہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔

”بہت تیز ہو گئی ہو تم!“ داوی جان نے مسکرا کر

## دلکش باتیں

☆ اپنی زبان پھول کی پتیوں کی طرح نرم اور لہجہ شبنم کے قطرؤں کے مانند گھٹکتہ رکھو۔

☆ مومن بے ہودہ باتیں سن کر منہ پھیر لیتے ہیں۔

☆ وہ انسان کم ظرف ہے جو احسان جتنا تا ہے۔

☆ خدا کی ذات بہت بڑی ہے وہ دے کر نہیں جتنا ہے۔

☆ خامیوں کو چھپانا کامیوں کو بلانا ہے۔

☆ ضبط نہ ہو تو زندگی میں ربط باقی نہیں رہتا۔

☆ ہر مسافر کو اپنا سفر تھما طے کرنا پڑتا ہے۔

☆ ماضی کو رد و حال و مستقبل کو کھوتا ہے۔

☆ بدگو..... بدناما ہو نہ ہو بد نصیب ضرور ہوتا ہے۔

☆ شہرت قربانی سے ملتی ہے دھوکے یا فریب سے نہیں۔

از: مسز نگہت غفاری کراچی

طرف متوجہ ہوں۔

وہ سب بہت دلچسپی سے گزرے وقت کی حسین یادوں کو دیکھ رہے تھے۔ دادا جان کی شاندار شخصیت اور دادی جان کی معنوی سی صورت نے دونوں کی جوڑی کو بہت خوب صورت بنا دیا تھا۔

”اب اپنی ایمانداری سے بتاؤ! کیا میں نے اپنے دور کے حساب سے گیٹ اپ نہیں اختیار کیا ہوا؟“ فیشن کوئی آج کے دور کی ایجاد نہیں ہے۔ یہ ہر دور میں اپنی مخصوص شکل میں رہا ہے اور آگے بھی رہے گا۔ اصل بات یہ نہیں ہے کہ آپ دنیا کے ساتھ کتنا تیز بھاگ رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ اس تیز رفتار دور میں بھی اپنی روایات کو کس طرح ساتھ لے کر دنیا کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اچھا پہننا اور چھنا، بچنا سنورنا یہ

”سب ٹھیک ہے اماں جان! خیریت؟“ امبر نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور کندھے اچکا کر بولی۔

”اگر بیٹا سب ٹھیک ہے تو تم اپنے اور میرب کے کپڑوں پر پیسہ خرچ کرتے ہوئے اتنی کجوسی سے کیوں کام لیتی ہو؟“ دادی جان نے اطمینان سے چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگایا۔ کزنی کا قہقہہ کافی اونچا تھا جبکہ یاسمین اور میرب بھی زور لب مسکرا دیں مگر امبر کے ماتھے پر لب پڑ گئے۔

”اماں جان! آپ نہیں جانتیں کہ آج کل کیا فیشن چل رہا ہے۔ اپ ٹو ڈیٹ رہنے کے لیے یہ سب کرنا پڑتا ہے۔“ امبر نے نخوت سے جواب دیا۔ دادی جان نے مسکرا کر اپنی تک چڑی بھوکی طرف دیکھا۔

”امبر بیٹی! تم اپ ٹو ڈیٹ ہونا کسے کہتی ہو؟ کیا بغیر دوپٹے، چھوٹی قمیص اور تنگ پینٹس پہنا تر ترقی پسند ہونے کی علامت ہیں؟ ہم بھی اپنے زمانے کے ترقی پسند لوگ ہی تھے۔ یقین نہیں کیا؟ اچھا ایسا کرو کزنی لی بچے بھاگ کر جاؤ اور میرب کے کمرے سے پرانے الیم اٹھا کر لاؤ۔ ہم اپنی بات پورے غیوت کے ساتھ ثابت کریں گے۔“ دادی جان نے حکم دیا تو کزنی فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر اندر کی طرف بھاگی۔ وہ جتنی تیزی سے گئی، اتنی ہی جلدی واپس آئی۔

”یہ یس دادی جان!“ کزنی نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بڑا الیم سامنے رکھی میرب رکھ دیا۔ دادی جان تھوڑا سا آگے ہوئیں۔ ان کی دیکھا دیکھی باقی سب نے بھی اپنی، اپنی کرسیاں آگے کھسکا لیں۔ دادی جان نے لال رنگ کی جلد والے بڑے الیم کو کھولا۔

”دیکھو بچو! میری شادی کے بعد کی تصویریں ہیں۔“ دادی جان آپ کتنی پیاری تھیں۔“ میرب نے نر جوئی انداز میں کہا۔

”سچی؟ کیا اب نہیں ہوں؟“ دادی جان نے گھورتے ہوئے کہا۔

”اوہو! اب تو آپ بہت پیاری ہیں۔“ میرب نے جلدی سے کہا تو دادی جان ہنس پڑیں۔

”بہت چالاک ہو۔“ وہ کہتے ہوئے الیم کی



رہی ہے تو اپنی حدود اور روایات کے مطابق امیزنگ!“ میرب نے متاثر کن لہجے میں کہا تو کنزنی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے اپنی روایات سے جڑے رہنا اچھا لگتا ہے میرب!“ کنزنی نے مجھداری سے کہا۔

”اور میں بھی ان روایات سے جڑنا چاہتی ہوں۔“ میرب نے حسرت بھرے لہجے میں کہا تو امبر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”اس میں اتنا حیران ہونے والی کوئی بات نہیں ہے بہو۔“ دادی جان نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایک بات یاد رکھنا! اپنی روایات کی کشش مقناطیس کی طرح ہوتی ہے آپ چاہے کتنا بھی دور بھاگ لیں، زندگی کے کسی نہ کسی مقام پر یہ آپ کو واپس اپنی طرف کھینچ ہی لیتی ہے۔ جیسے چاہے آپ ساری زندگی اپنی زمین اور مٹی سے منکر ہو کر گزاردیں مگر جب آخری خراش کا وقت آتا ہے، تو آپ اپنی مٹی میں اپنی روایات کے مطابق دفن ہونا ہی وصیت کرتے ہیں اور یہ ہی انسان کا اصل ہوتا ہے۔“ دادی جان کے لفظوں نے کچھ دیر کے لیے امبر کو کسی اور گھر کے کچے انگن میں پہنچا دیا تھا۔ پھر وہ چونکی اور اسے آس پاس بیٹھے لوگوں کو خوش گپیوں میں مصروف دیکھ کر گہری سانس لے کر رہ گئی۔

”اماں جان! روایات کی کشش مقناطیس جیسی ہے صحیح! مگر کیا پیچھے مڑ کر دیکھنا آسان ہوتا ہے؟“ امبر نے بوجھل دل کے ساتھ سوچا۔ پتا نہیں کیوں جب سے پاکستان آئی تھی۔ حال میں جگہ جگہ گئے ماضی کے پھندوں میں اس کا پاؤں اٹکنے لگا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ ہمیں کسی روز وہ منہ کے بل نہ گر جائے۔

☆☆☆

”یہ میری زندگی کا بہترین رمضان ہے۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا کہ عید آنے میں کچھ دن ہی رہ گئے ہیں۔“ میرب نے حیرت سے کہا تو اس بیٹھے خیام مسکرایا۔

”ابنوں کے ساتھ گزرا وقت ہمیشہ بہت تیزی سے گزرتا ہے۔“

آپ کا حق ہے مگر آپ کو یہ پتا ہونا چاہیے کہ کون سی چیز آپ کی مقرر کردہ حدود سے ٹکرا رہی ہے۔ ہمارے زمانے میں جو بھی فیشن آیا یا سب اختیار کرتی تھی۔ مزے کی بات بتاؤں میں اپنے خاندان میں بہت مشہور تھی۔ خاندان کی دوسری لڑکیاں میرے ساتھ شاپنگ کرنے بازار جاتیں۔ مجھ سے مشورے کر کے کپڑے بنواتی۔ میں نے غراے سے لے کر چھوٹی شرس، فراک، پاجامے سب ہی پہنا ہے مگر تمیز کے دائرے میں۔ سچے سنور نے، کاجھے بہت شوق تھا اور ان تصاویر سے میرا شوق بھی ظاہر ہو رہا ہے۔“ وہ لمحہ بھر کو رکیں۔

”مگر ایک اور چیز بھی ان میں نمایاں ہوئی کہ ان

سب میں میرے دور کی سب روایات اسی طرح موجود ہیں۔ میں نے ذہنی آزادی کا مزہ، آزاد وجود کے ساتھ اٹھایا ہے مگر آج ہم لوگ ذہنی طور پر اپنا آپ دوسروں کے پاس گروی رکھے ہوئے ہیں مگر ہمارے جسم آزاد ہیں۔ دوسروں کی نقالی کرتے ہوئے ہم دراصل ان کی غلامی اختیار کر لیتے ہیں۔ جو چیز ہمارے مذہب یا روایات میں شامل ہی نہیں، انہیں ہم صرف اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ بانی دنیا یہ سب کر رہی ہے۔ حیرت کی بات ہے ناں!“ دادی جان نے بات ختم کی تو یاسمین نے سب سے پہلے اثبات میں سر ہلایا۔

”ٹھیک کہتی ہیں آپ! اماں جان!“

”میں بھی آپ کی بات سے مکمل طور پر متفق ہوں دادی جان! یہ فیکٹ ہے کہ جب ہم امریکا یا ہوتے ہیں تو ہم وہاں کے رہنے والے لوگوں کی کاپی کرتے ہوئے، ویسا ہی کیٹ اپ اختیار کر لیتے ہیں جبکہ وہ لوگ ایسا نہیں کرتے ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم لوگ کمزور ہیں ذہنی طور پر۔ جو فوراً کسی کے زیر سایہ آ جاتے ہیں۔“

میرب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو یاسمین اور دادی جان نے اس کی طرف دیکھا۔ جبکہ امبر ہونہ کہہ کر رہ گئی۔

”میں جب سے پاکستان آئی ہوں میں نے کنزنی کے ساتھ، ساتھ باقی لوگوں کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ کنزنی نے جنم، لاگ اور شات شرس بھی پہنی ہیں مگر بہت طرے کے ساتھ۔ یعنی اگر وہ فیشن کر بھی



## اینبوں کے سنگ

لڑکوں کا کیا کام؟“ امبر نے ہمیشہ کی طرح اعتراض کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیا۔

”وہ ہی کام ہوگا، جو ہمارا لڑکوں کی شاپنگ میں ہوگا یعنی ایک دوسرے کو مشورے دینے کا یا یوں کہیے کہ صرف ہلکا کر کے۔“ میرب نے اطمینان سے جواب دیا تو خیام نے سمجھ کر سر ہلایا۔

”اچھی بات ہے۔ سب ایک ساتھ ہی جاؤ اگر دیر سویر ہوگئی تو مجھے اطمینان رہے گا کہ فیضان جیسا سمجھدار لڑکا تم لوگوں کے ساتھ ہے۔“ خیام نے کہا تو میرب مسکراتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔ امبر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر خیام نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

”بے فکر رہو! مجھے لگتا ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“

”کیا مطلب؟“ امبر نے حیرت سے پوچھا۔

”مطلب تمہیں آج کل میں پتا چل جائے گا۔“ خیام نے پُر اسرار سے انداز میں کہا اور وہاں سے اٹھ گئی۔ امبر وہاں بیٹھی خیام کی بات سوچتی رہ گئی مگر اسے کچھ سمجھ نہیں آئی۔ دو دن بعد جب دادی جان کی سرپرستی میں بڑے بھائی صاحب اور یاسمین مٹھائی کے ڈاکر کے لیے ان کے گھر پہنچے تو امبر کو خیام کی بات کا مطلب سمجھ آیا۔

وہ لوگ فیضان کے لیے میرب کا ہاتھ مانگنے آئے تھے۔ خیام کی یہ بدی خواہش تھی۔ امبر نے کئی بار ٹھنڈے دل سے سوچا تو اسے بھی اس رشتے میں کوئی برائی نظر نہیں آئی بلکہ یہ تو اچھا تھا کہ میرب اپنے ہی لوگوں میں جاتی اور ان کی نظر کے سامنے رہتی۔

خیام کی ہاں سنتے ہی سب کا منہ ٹھٹھا کر دیا گیا۔ طے پایا کہ عید کے تیسرے دن دونوں کی مٹھائی کر دی جائے گی اور شادی ایک سال تک۔ دادی جان نے میرب کو بلایا اور اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے نظر اتاری۔ تو میرب شرمائی۔ میرب کے چہرے پر پچھلے بچی خوشی کے رنگ دیکھ کر امبر کا دل پُر سکون ہو گیا اور وہ بہت سے دواہوں سے آزاد ہو گئی۔

☆☆☆

”جی نہیں!“ امبر نے تھکے انداز میں خیام کی طرف دیکھا۔

”وقت کی رفتار ویسے ہی تیز ہے۔ اس کا سہرا کسی کے سر مت ڈالیں۔“ امبر نے منہ بنا کر کہا تو خیام نے کندھے اچکا دیے جبکہ میرب نے سوچنے والے انداز میں اپنی الزامارڈن ماں کی طرف دیکھا۔

”مما! میں آپ کے دل کا حال سمجھ سکتی ہوں۔“ میرب نے ہمدردی سے کہا تو خیام اور امبر نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جہاں سوچ کے سائے لہرا رہے تھے۔

”یہ سب آپ اس لیے کہہ رہی ہیں کیونکہ آپ کا کوئی اپنا نہیں ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ آپ اپنے والدین کی اکھوتی اولاد میں اور آپ کے والدین تو تب ہی وفات پا گئے تھے جب آپ بارہ سال کی تھیں! اما آپ نے کتنی محرومی دیکھی ہے ناں۔“

میرب باپ کے پاس سے اٹھ کر ماں کے پاس آکر بیٹھ گئی اور اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ امبر اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔ آج میرب نے اپنی سادگی میں اس کے دل پر لگے زخموں کو چھڑ دیا تھا۔ جن میں سے آج کل ویسے ہی بہت ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ امبر کی نگاہوں کے آگے بہت سے دھندلے منظر گھومنے لگے مگر اس نے فوراً سر جھٹک دیا۔ وہ اپنے ماضی سے ایسے ہی دور بھاگتی تھی جیسے وہ کوئی آسیب ہو اور اس سے لپٹ جائے گا۔

”یہ سب باتیں چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ عید کی شاپنگ کب کرنی ہے؟“ امبر نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

میرب فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”مما! ہم سب نے پلان کیا ہے کہ عید کی شاپنگ ایک ساتھ کریں گے۔“ میرب نے برجش انداز میں کہا۔

”ہم سب کون؟“ امبر نے تھکے انداز میں پوچھا۔

”میں، کنزلی، زین، آؤر اور فیضان بھائی! فیضان بھائی یونیورسٹی سے فری ہونے والے ہیں۔ بس پھر ہم روز شاپنگ پر جایا کریں گے۔“ میرب نے خوشی سے بتایا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟ لڑکیوں کی شاپنگ میں

وہاں لے کر جاؤں گا۔ اچھا ہے تمہارے بہانے مجھے بھی عید مل جائے گی۔“ خیام نے شرارتی انداز میں کہا تو میرب خوشی سے اچھل پڑی۔ امبر گہری سانس لے کر رہ گئی۔

☆☆☆

دادی جان پستہ رنگ کی ہلکی اور نفیس کڑھائی والا خوب صورت سا سوٹ پہنے اپنے تخت پر براجمان تھیں۔ گھر کے سب لوگ ان کے ارد گرد جمع تھے۔ جب وہ تینوں وہاں پہنچے تو کنزئی کے اشارے پر زین اور آذر نے ایک ساتھ اونچا ”اووو“ کہا۔ میرب جو خوش، خوش وہاں آئی تھی ایک دم ہی کنفیوز ہو گئی۔ جبکہ سفید کپڑوں میں ملبوس فیضان زپر لب مسکرانے لگا۔ یاسمین نے کنزئی کو گھوری ڈالی اور امبر نے زین اور آذر کو۔

”یہ آپ دونوں خواتین اپنی نظروں سے میزائل حملے کر کے معصوم بچوں کو ڈرانا بند کریں! اور فیضان بیٹا! چلو تم جاؤ کچن دیکھو۔ اچھی سی چائے دم کر کے لانا۔ تمہاری سسرال والے آئے ہیں۔“ بڑے بھائی صاحب نے شرارت سے کہا تو سب ہلکھلا کر ہنس پڑے۔ میرب امبر کے پیچھے چھپنے لگی۔

”چلو! اب کیوں شر مار رہی ہو تمہیں بہت شوق تھا نا!“ امبر نے دانت چیس کر کہا۔

”ادھر آؤ میری بچی!“ اسی وقت دادی جان نے اسے آواز دے کر بلا لیا۔ دادی جان نے اسے پیار کرتے ہوئے جب عیدی تمھاری تو زین اور آذر کے ساتھ ساتھ کنزئی بھی اچھل پڑی۔

”یہ نا انصافی یہاں نہیں چلے گی! آپ نے کہا تھا کہ سب بچوں کو ایک جتنی عیدی ملی گی۔ مگر میرب کو زیادہ کیوں ملی؟“

”کوئی بات نہیں! میرے حصے کی بھی دے دیں۔ میں نہیں لوں گا۔“ فیضان نے دھیمی آواز میں کہا تو بیک پارٹی نے اسے ایک ساتھ گھورا۔ فیضان فوراً سر کھجائے لگا۔

”بھئی میرب کا مقام اب تم لوگوں سے اونچا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ اس لیے اسے عیدی بھی زیادہ ملے گی۔“

”مما! وہاں سب اکٹھے ہوں گے۔ میں بھی جاؤں۔۔۔۔۔ پلیز ممما!“

میرب بچوں کی طرح ضد کر رہی تھی۔ کچھ دیر میں خیام اور دونوں لڑکے عید کی نماز پڑھ کر آئے اور اب زین اور آذر اسے ستانے کے لیے ہار پاؤں دادی جان کے گھر جانے کا ذکر کر رہے تھے کہ ہم سب کنزں وہاں مل کر بہت مزہ کریں گے۔ میرب جس نے عید کی شاپنگ کے لیے کیا، کیا پلان بنائے تھے اس کی منگنی طے ہوتے ہی، امبر کو مختلف پابندیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کے ظاہری حلیے میں تو کافی پہلے ہی تبدیلی آ گئی تھی مگر پھر بھی امبر اسے سمجھاتی رہتی کہ اب اسے اپنے سسرال کے ماحول کے مطابق خود کو بدلتا ہے۔ امبر نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو بھی موقع ملے کہ وہ اس کی تربیت پر انگلی اٹھائے۔ اس لیے وہ میرب کو ٹوٹی رہتی۔

”میرب اچھا نہیں لگتا۔ پرسوں تمہاری منگنی ہے اور تم آج اپنی سسرال پہنچ جاؤ۔“ امبر نے جتنی سے کہا تو وہ منہ بنا کر بیٹھ گئی۔

”آپ بارہ بار میرا سسرال کہتی رہتی ہیں۔ وہ میری دادی کا گھر بھی تو ہے۔ میری پہلی عید ہے پاکستان میں۔ کنزئی نے مجھے اتنا کچھ بتایا تھا کہ صبح نماز کے بعد سب دادی جان کے پاس سلام کرنے آتے ہیں اور دادی جان سب کو عیدی دیتی ہیں! اما کتنی ٹھنسی ہے ناں! مجھے بھی جانا ہے۔ آذر اور زین بھی تو گئے ہیں۔“ میرب نے رو ہانسی ہو کر کہا تو ایک لمحے کے لیے امبر کا دل پھٹل گیا۔

”تمہاری عیدی وہ دے تو مجھے تھے۔“ امبر نے زنج ہو کر کہا۔

”مجھے نہیں پتا!“ میرب نے بچوں کی طرح ضد کی۔ ”ارے عید والے دن گون ہماری بیٹی کو نرلا رہا ہے۔“ خیام نے پاس آ کر میرب کو خود سے لگا لیا۔ ”آپ خود ہی دیکھیں کہ۔۔۔“ امبر نے کچھ کہنا چاہا تو خیام نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

”میں سب سن چکا ہوں۔ میں اپنی بیٹی کو خود

## ابنوں کے سنگ

روایت ہے جس میں ہمارے بچپن کی خوشی جیسا منفرد احساس ہمیشہ تازہ دم رہتا ہے۔ عموں کی اتنی منزلیں طے ہونے کے باوجود اس روایت کی بدولت آج بھی بہت کچھ پہلے جیسا لگتا ہے۔ ”خیام نے تفصیل سے بتایا تو سب بچے باپ کے گرد بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اچانک امیر بھی اور خیام کو مخاطب کر کے کہا۔

”میں شاہی منزل جاری ہوں۔“ خیام نے چونک کر اس کی طرف دیکھا مگر امیر نظریں چرائی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

”شاہی منزل!“

تینوں بچوں نے ایک ساتھ حیرت سے دہرایا تھا۔ خیام نے اثبات میں سر ہلایا اور انہیں شاہی منزل کے بارے میں بتانے لگے۔

☆☆☆

اندرون لاہور کی تنگ وہ تاریک گلیوں میں بڑی سی چھپائی کار ”شاہی منزل“ سے بہت دور پارک کرنا پڑی۔

”آپ یہ سب سامان اٹھا کر لے آئیں!“ امیر نے گاڑی سے اترتے ہوئے کھانے پینے کی مختلف اشیاء سے بھرے شاپر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی آگے بڑھنے لگی۔ اس کی شاندار شخصیت اور مہنگی گاڑی دیکھ کر بہت سے لوگ رک گئے۔ جبکہ وہ وہ ماضی کے پھندے میں بار، بار پاؤں اڑنے کی وجہ سے رک رہی تھی۔ ان تنگ و تاریک گلیوں میں اس کا بچپن اور جوانی گزری تھی۔ والدین کے مرنے کے بعد اس کی پرورش کا ذمہ بڑی اور اکلونی خالہ بقیس نے بخوشی اپنے سر لیا تھا۔ خالہ بقیس کی اپنی بھی نو اولادیں تھیں مگر پھر بھی ان کا دل امیر کے لیے بہت کشادہ تھا۔ ان کے پانچ مرنے کے چھوٹے سے گھر میں امیر کا دم گھٹتا تھا۔ خالہ بقیس کو اس سے جتنی محبت تھی، امیر کو ان سے اتنی ہی چڑ..... عام سنی سنائی کہانیوں کی طرح، وہ والدین کے مرنے کے بعد مظلومیت اور مجبوری کی چادر تلے نہیں پٹی بڑھی تھی بلکہ خالہ بقیس کے گھر میں بھی وہ بہت ٹھٹھ سے رہتی تھی۔ خالہ بقیس نے غربت اور تنگدستی کے باوجود اسے اچھے

دادی جان نے فیصلہ کن انداز میں کہا مگر یک پارٹی دھاندلی، دھاندلی کا شور ڈالتی رہی مگر دادی جان نے بھی پروا نہیں کی۔ میرب زرب لب سمراتی رہی۔ دادی جان نے اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ، ساتھ دونوں بہوؤں کو بھی عیدی دی۔ عیدی تمام کر خیام کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو آ گئے۔ جسے میرب اور امیر نے دیکھ لیا۔ یاسمین اور بھائی صاحب نے بھی میرب کو الگ، الگ عیدی دی۔

”میرب کے تو مرنے ہیں۔“ کنزلی نے منہ بنا کر کہا۔

”مجھ سے چھوٹی ہو کر پہلے مگنی شدہ بھی ہو گئی ہیں اور خوب پروں کو مل بھی مل رہا ہے۔“ کنزلی نے کہا تو میرب اور مسکرانے لگی۔

”کوئی بات نہیں کنزلی! آپ! ہم میرب آپلی سے اچھی سی ٹریٹ لیں گے۔“ زین اور آذر نے یاسمین سے کہا۔ سب بڑے باتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ اب یک پارٹی ایک طرف کھسک گئی۔

”تمہیں تو میں اچھی طرح ٹریٹ دوں گی۔ کتنا دل جلا رہے تھے میرا اب دیکھو۔“ میرب نے اسے منہ چراتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے پیسے لہرائے۔ جب اس کی نظر کچھ دور بڑوں کے درمیان منڈب پیٹھے فیضان پر پڑی جو کن انھیوں سے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرب کے منہ چراتے پر بے ساختہ مسکرا دیا۔ جبکہ میرب شرمندہ ہو کر رہ گئی۔ نظروں کا یہ کھیل بہت دلچسپ اور دلقریب تھا۔ میرب اور فیضان ایک دوسرے سے بات نہ کرتے ہوئے بھی اپنے دل کا جال ایک دوسرے پر عیاں کر رہے تھے ایک پُر تکلف لچکے کے بعد وہ گھر واپس لوٹے۔

”پاپا! جب دادی جان نے آپ کو عیدی دی تو آپ جذباتی کیوں ہو گئے تھے؟“ میرب نے اچانک باپ سے سوال کیا تو خیام مسکرا دیے۔

”پاپا کی جان! میں پچھلے سال میں لاکھوں کروڑوں کمالوں مگر جو مزہ اپنے بڑوں سے عیدی لینے کا ہے، اس کا نعم البدل کچھ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی

آئی ہے۔ جلدی سے کچھ ٹھنڈا لے کر آؤ۔“ خالہ بلقیس کے ہاتھ پاؤں بھول گئے۔ ڈرائیور نے سارے شاپرز لارکے کو سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

”اس ٹکلف کی کیا ضرورت تھی؟“ خالہ بلقیس نے کہا تو امبر مسکرا دی۔

”اتنے سالوں کے بعد آپ سے ملنے آ رہی تھی۔ خالی ہاتھ کیسے آئی۔“

امبر نے کہا تو خالہ بلقیس نے سر ہلایا اور سب سے امبر کا تعارف کروایا۔ امبر چہرے پر مسکراہٹ لیے سب کو دیکھتی رہی۔ ان کے چہروں پر اتنی خوشی تھی۔ سب اس کے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ امبر کو شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ کافی دیر بیٹھ کر وہ وہاں سے جانے کے لیے اٹھی۔ وہ سب سے مل کر دروازے کے پاس پہنچی۔ جب خالہ نے اس کا ہاتھ تھام کر روکا۔

”عید کا دن ہے! اپنی خالہ سے عیدی نہیں لو گی؟“ خالہ بلقیس نے کہتے ہوئے اپنے دوپٹے کے پلو سے بندھا ہوا پانچ سو کا میلا سا نوٹ نکالا اور امبر کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ امبر کو لگا جیسے اس کے ضبط کا بندھن آج ٹوٹ جائے گا۔ وہ ان سے مل کر رو پڑی۔ خالہ بلقیس نے محبت سے اس کا کندھا چھتا دیا۔

امبر اعلیٰ ملاقات کے وعدے پر وہاں سے چلی آئی۔ واپسی میں اٹھایا ہر قدم خوشی سے سرشار تھا۔ اس نے اپنی مٹھی میں پانچ سو کا نوٹ ایسے دبوجا ہوا تھا جیسے وہ قاریوں کے خزانے کی چابی تھا۔ امبر کو گھر جانے کی جلدی تھی۔

وہ خیام کو، اپنے تینوں بچوں کو بتانا چاہتی تھی کہ اس کے پیچھے بھی کوئی ہے جو ہاتھ اٹھا کر اس کے لیے دعا کرتا ہے۔

وہ بچاری یا مسکین ہر گز نہیں ہے۔ ہاں بس کچھ دیر کے لیے وہ راستے سے بھٹک ضرور ملے گی مگر وہ آج پھر اپنی زندہ روایت کی ایک سد بہار لڑی سے دوبارہ جڑ گئی۔ دیر سی ہی سہی مگر اس نے جان لیا تھا کہ زندگی کا ہر رنگ، اپنوں کے سنگ ہی پیارا لگتا ہے۔

سے اچھا کھلانے اور پہنانے کی کوشش کی تھی۔

جبکہ ان سب چیزوں سے ان کی اپنی اولادیں محروم رہی تھیں مگر امبر نے یہ سب حق سمجھ کر وصول کیا۔ اس نے بھی کسی کی پرستگوتائیں کیا تھا۔ وہ یونیورسٹی کے پہلے سال میں تھی جب اسے اپنے خوابوں کا شہزادہ خیام کی صورت میں ملا۔ جو اسے اس پرانے محلے سے نکال کر دور بہت دور ایک حسین دلیس لے گیا۔ جہاں جا کر امبر سب بھول گئی۔ پرانے محلے میں بسنے والوں سے لے کر اپنے خون کے سب رشتوں کو۔

امبر نے بھی پلٹ کر کسی سے رابطہ نہیں کیا۔ خالہ بلقیس کی طرف سے یہ کوشش پہلے کئی بار ہوئی مگر امبر کے روکے روئے نے انہیں بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ آج امبر ایسی پرانے محلے میں، اجنبی میں، کہنوں کی دہلیز تک پہنچی۔ حسد معمول دروازہ کھلا ہوا تھا۔

”ارے کم بختو! آج عید کے دن تو گھر میں سکون رہنے دو۔ ابھی تمہاری ماں نے معافی کی تھی پھر سے گنڈ ڈال دیا ہے۔“ شہر و بچے اٹھنے دو ڈرا۔ سیدھا کرتی ہوں۔“

خالہ بلقیس بچوں کو ڈانٹ رہی تھیں مگر اتنی نرم آواز میں جیسے حال پوچھ رہی ہوں اب اس میں ان کے بڑے بچوں کے بچے بھی شامل ہو گئے تھے۔ وہ شروع سے ایسی تھیں۔ ان کے غصے میں بھی عجب نرمی ہوتی تھی۔ اس لیے تو کسی پر ان کا رعب قائم نہیں ہوا تھا۔ اب بھی بچے ہنسنے لگے مگر جب ایک انجان عورت کو اپنے مچن میں کھڑے دیکھا تو ڈر گئے۔

”کون ہے؟“ خالہ بلقیس نے اپنی عینک ٹھیک کرتے ہوئے غور سے دیکھا۔

”ارے میری امبر آئی ہے۔“ ایک لمحے میں وہ پہچانیں اور اپنے دونوں بازو اُٹھ کر دیے۔ امبر بھاگ کر ان کے گلے لگ گئی۔ شفیعی دیر دونوں آنسو بہاتی رہیں۔ گھر کے باقی لوگ بھی ان کے آس پاس جمع ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے پچھلی منڈی ہو۔ مختلف آوازیں اور ان سے ملا جلا شور!

”چپ کرو سناڑے! اپنی اتنے سالوں کے بعد

